علمی و تحقیقی مجلہ "محاکمہ" یونیورسٹی آف سیالکوٹ

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

منیر عباس سپرا، پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، منہاج یونیورسٹی لاہور

صفیہ بی بی، پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، منہاج یونیورسٹی لاہور

طاہرہ اقبال کے ناول "گراں" میں پوٹھوہاری ثقافت کے عناصر

Elements of Pothohari Culture in Tahira Iqbal's Novel 'Giran'

Munir Abbas Sipra, Ph.D Scholar, Urdu Department, Minhaj University Lahore

Safia Bibi, Ph.D Scholar, Urdu Department, Minhaj University Lahore

ABSTRACT

Tahira Iqbal is a renowned writer. Her pen has not made the closure of the genres, she has experimented in novel, fiction, essay writing and column writing. One of her novel "Giran" is written in the background of Pothohari.Culture is one such term which is used as a collection of manners and manners in all spheres of life. What is the name of the results derived from the observations and results of tests and situations and events and extensive experiences to the present generations is culture.The culture of the Pothohar region is also unique. Lifestyle, food, hobbies and engagements, clothes, language and literature, ethics and society, everything in its place was the characteristic of the Pothohar region. Extreme tenacity and hard work is his demand, his land is fertile. Tahira Iqbal has created this novel "Giran" in the context of these cultural aspects.

Keywords: Tahira Iqbal, Cultural Novel, Lifestyle, Hard work, Liberalism, Cultural Colors, Loyalty.

طاہرہ اقبال ایک معروف افسانہ نگار، ناول نگار، نقاد اور ماہرِ تعلیم ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں سنگ بستہ، گنجی بار اور ریخت شامل ہیں۔ مٹی کی سانجھ کے نام سے ان کا ایک ناول بھی منظرِ عام پر آ چکا ہے۔ ان کے ناولز 'نیلی بار'، 'گراں' اور 'ہڑپا' کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں۔ ان کی تحریروں کو پڑھ کر یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ طاہرہ اقبال کے آنے والے دنوں میں ان کے قلم سے وہ شاہکار تحریر ہو گا کہ مستقبل کے قاری اس کو ادب کا سرمایہ کہہ سکتے ہیں۔ اُنھوں نے روزنامہ خبریں میں "توجہ طلب" کے نام سے

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

کالم لکھنا شروع کیا۔ ان کا یہ تخلیقی سفر جاری و ساری ہے، اُنھوں نے کئی اصنافِ ادب میں طبع آزمائی کی ہے اور سرمایہ ادب میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ ان کا ناول "گراں" پوٹھوہاری ثقافت کے پسِ منظر میں لکھا گیا ناول ہے۔

سب سے پہلے ثقافت کیا ہے، اس کا سمجھنا بھی ضروری ہے۔ ثقافت عربی زبان کا لفظ ہے اور اب اردو میں یہ لفظ کئی سالوں سے استعمال ہونے لگا ہے۔ کسی بھی علاقے کے لوگوں کے رہن سہن کا طریقہ ان کی ثقافت کہلاتا ہے۔ کسی علاقے کی زبان، رسم و رواج، لباس، روایات، میلے ٹھیلے اور پکوان وغیرہ ثقافت کا حصہ ہیں۔ ثقافت ایک ایسی اصطلاح ہے جو زندگی کے تمام شعبوں کے آداب و اطوار کے مجموعے کے طور پر بروئے کار لائی جاتی ہے۔ جو موجودہ نسلوں کو پرکھوں کے مشاہدات و نتائج اور حالات و واقعات اور وسیع تجربات سے اخذ کیے گئے نتائج ہیں۔ ثقافت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے عبد الباری لکھتے ہیں:

> "ثقافت ایک گروہ کے طرزِ حیات کا نام ہے جب کہ معاشرہ باہم عملی تعاون کرنے والے اور منظم افراد کا ایسا گروہ ہے جو ایک طرزِ حیات اختیار کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ معاشرہ افراد سے بنتا ہے اور افراد جس طرح برتاؤ کرتے ہیں، اسے ثقافت کا نام دیا جاسکتا ہے۔"(1)

برِ صغیر میں مختلف قومیں اپنی ثقافت کے ساتھ آباد تھیں، انھوں نے اپنے ثقافتی ورثے کو آباد رکھا اور یہ ثقافتی ورثہ مختلف انداز میں آج بھی زندہ ہے۔ ہر قوم ایک منفرد ثقافت کی امین ہے۔ مقامی ثقافتیں بھی کچھ فاصلے کے بعد کچھ رنگ بدل دیتی ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ جو عوامل ثقافت پر اثر انداز ہوتے ہیں، اس میں جغرافیائی حالات سرِ فہرست ہیں تو بے جا نہ ہو گا کیوں کہ جو علامات جغرافیائی لحاظ سے جیسے اطوار کا حامل ہوتا ہے، وہاں کے بود و باش اسی کی مناسبت سے طے ہوتے ہیں جو ثقافت کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں۔

کسی قوم کی منفرد ثقافت ہی اسے دوسری قوموں سے منفرد بناتی ہے۔ اقوامِ عالم میں ہر قوم اپنے حالات کی مناسبت سے مختلف تہذیبی جہت رکھتی ہے۔ یہی تہذیبی و ثقافتی عوامل قوموں کے طرزِ زیست کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا نے زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں تغیر برپا کیا ہے۔ انفرادی ثقافت کے رجحان کو اجتماعی تہذیب میں بدلنے کا نعرہ زور پکڑتا جا رہا ہے۔ ترقی یافتہ عہد کے معروف لوگوں کے ہاں بظاہر یہ یک رنگی ثقافت بڑی خوش نما اور بھلی معلوم ہوتی ہے مگر حقیقی طور پر یہ ترقی اور ماڈرن ازم کے لبادے میں ملفوف دھوکا ہے کیوں کہ یہ ثقافتی یگانگت نہ صرف اقوامِ عالم سے ان کی تابناک اقدار ترک کروائے گی

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

بل کہ یہ عالمی طاقتوں کے استعمار اور اجارہ داری کا بھی پیش خیمہ ہے۔ ثقافتی یگانگت کی آڑ میں جو جدیدیت متعارف کروائی جا رہی ہے اس کا سرا مغربی اقوام کے ہاتھ میں ملتا ہے۔ ثقافتی حد تک سرحدیں اپنی جگہ پر قائم رہنی سمٹ چلیں۔ ثقافت کی یگانگت اور یک رنگی اوصاف نے پورے عالم کو متاثر کیا ہے۔ ثقافت کے مفہوم کو مزید واضح کرتے ہوئے عبدالحمید یوں رقم طراز ہیں:

> "ثقافت ایک ایسا مرکب ہے جس میں عقیدہ، اخلاق، قانون، رسوم و رواجات اور وہ تمام صلاحیتیں اور عادتیں شامل ہیں جنھیں انسانی معاشرے کے رکن کی ایک خاص اہمیت کی حیثیت سے قبول کیا جاتا ہے۔"(2)

اسی امر کو اگر ایک دوسری جہت سے سوچا جائے تو ایک منفی رد عمل سامنے آتا ہے۔ دنیا کی پسماندہ قومیں جدیدیت کو اس انتہا پسندی سے دیکھتی نظر آتی ہیں کہ وہ عہد کے ساتھ قدم بہ قدم چلنے سے معذور ہیں۔ جدیدیت اور ٹیکنالوجی کا استعمال اور فہم عہدِ حاضر کی بنیادی ضرورت ہے۔ عالم میں شدت پسند قومیں اپنی ثقافت کی حفاظت کرتے کرتے دنیا کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتیں اور نتیجتاً پیچھے رہ جاتی ہیں۔ وہ علم و فہم کے ان جدید ذرائع کو حریف سمجھتے ہیں، یہ شدت پسندی بھی اپنی طرز میں ایک جہالت ہے۔ ثقافت اور جدید ٹیکنالوجی کا اشتراک ہی اقوامِ عالم میں ترقی کا ضامن ہے۔

ہر قوم کی اپنی ایک الگ ثقافت ہوتی ہے۔ برصغیر کے مختلف علاقوں کی ثقافت میں کچھ یگانگت کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ موسمی حالات، خوراک و لباس کا تعین کرتے ہیں تو جغرافیائی حالات رہن سہن اور فنون لطیفہ کو متعین کرتے ہیں۔ مٹی کی ساخت بتاتی ہے کہ علاقہ زرعی ترقی میں کہاں تک جا سکتا ہے اور سطحی عوامل اس کے صنعتی استعمال سے متعلق بتاتے ہیں یوں، بہت سارے عوامل مل کر ثقافت کو ترتیب دیتے ہیں۔ یہ فردِ واحد کی منشا ہوتی ہے اور نہ ایک دن میں مرتب ہونے والی کہانی بل کہ ثقافت صدیوں سے چلی آ رہی موجودہ عہد کو پہنچتی داستان ہے جس نے بے شمار قوموں کے لاتعداد اصول و ضوابط اور روزمرہ کے اہداف کو یوں اپنے اندر سمیٹ کر آگے بڑھایا جیسے سارے دریاؤں کو سمندر لے کر بڑے بحر میں جا گرتا ہو۔

خطہ ہائے پوٹھوہار کی ثقافت بھی اپنے اندر منفرد انفرادیت رکھتی ہے۔ بود و باش، رہن سہن، خوراک، مشغلے و مصروفیات، لباس، زبان و ادب، اخلاقیات و سماج سب کچھ اپنی جگہ خطہِ پوٹھوہار کا واحد شعبہ تھا۔ انتہائی جفاکشی اور محنت اس کا مطالبہ ہے۔ ان کی زمین زرخیز ہے، مونگ پھلی اس علاقے کی اہم پیداوار ہے۔ اس کے علاوہ گندم اور مکئی بھی کاشت کی جاتی ہے۔ مرد و خواتین بلا کے جفاکش ہیں، عورتیں اپنے مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں۔ خواتین کے گھریلو امور بھی نہایت دقت طلب اور صبر آزما کام ہیں۔ دشوار گزار پہاڑی راستوں پر اترتی چڑھتی یہ خواتین بلاشبہ محنتی اور جفاکش ہیں۔

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

پوٹھوہار کے ریت رواج بھی اپنی نوع میں انفرادیت رکھتے ہیں۔ یہاں شادی بیاہ کو آج بھی روایتی طریقوں سے منایا اور سجایا جاتا ہے۔ مرگِ ماتم کو مل بانٹ کر نبھایا جاتا ہے۔ خوشیاں اور غم سانجھے ہوتے ہیں، جن کو مل بانٹ کر گزارا جاتا ہے۔ خوشیوں کے الگ اور لذیذ پکوان ہوتے ہیں جن کو خواتین کئی دن کی محنت کے بعد پیش کرتی ہیں۔

اس خطے کی عورتیں اور مرد دونوں مبہم سے رومانس کے حامل ہوتے ہیں۔ جو جدید دنیا کی طرح عریاں اور برہنہ نہیں ہوتا بلکہ دل کی گہرائیوں میں اس کا لمس موجود ہوتا ہے۔ اس کو محسوس کر کے کے سینت سینت کے کے رکھا جاتا ہے۔ مردوں کے دور جانے کے بعد بھی اس میں تغیر نہیں آتا بلکہ پوٹھوہار کی عورتیں اپنی آتی جاتی سانسوں سے اس شجر سایہ دار کی آبیاری کرتی ہیں۔ ان کی محبتیں دل کے نہاں خانوں میں چھپی ہوتی ہیں بعض تو ایسی کہ محبوب کے نقش وپا کو دیکھ کر ساری عمر گزار دیتی ہیں۔ خطہِ پوٹھوہار میں ذاتی ملکیت کا رواج عام نہیں ہے۔ رشتے ہوں یا چیزیں اجتماعی ہوتی ہیں، گھر کچے ہیں لیکن خلوص اور رشتے اٹوٹ ہیں۔ یہاں ذاتی فیصلوں کا حق آج بھی خاندان کے سربراہ کو بخشا جاتا ہے۔ اپنی منشا کی روش کا نہ رواج عام نہ اجازت، دیگر خطوں کی طرح پوٹھوہار میں بھی مقامی ثقافت موسموں کے ساتھ رنگ بدلتی ہے۔ موسمی اعتبار سے مختلف اشیا کو حصہ خوراک بنایا جاتا ہے۔ مقامی پیداوار کو بھی خوراک میں بطور جزو استعمال کیا جاتا ہے۔ پوٹھوہار میں جدت کے آنے کے بعد آج بھی روایتی طریقہ ہائے کاشت کو بروئے کار لاکر اجناس کو بڑے پیمانے پر کاشت کیا جاتا ہے۔ وہاں کے باسی آج بھی اپنی ثقافت کو چوم کر گلے لگانے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہاں آج بھی مردوں کو روایتی احترام دیا جاتا ہے، رشتوں میں تقدس اور خاندانوں میں حیا کا رواج آج بھی برقرار ہے۔ مال مویشی ان کے دیہاتوں کی زینت ہیں۔

دورِ حاضر میں لبرل ازم کی وجہ سے جو تغیرات برپا ہوئے، اس نے دیگر خطوں کی طرح خطہِ پوٹھوار کو بھی بڑی حد تک تبدیل کیا۔ نظاموں میں جدت اور آسائش کی فراوانی لائی گئی۔ ترقی کی جستجو اور شرح دونوں بلند ہوئے۔ اس ترقی اور جدت کے حصول کے لیے روایتی عناصر کو بڑے پیمانے پر متروک بنایا گیا اور اس کی جگہ نئی چیزوں نے لی لیکن اس خطہِ زمین پر آج بھی اپنی ثقافت کے رنگ موجود ہیں پھر چاہے وہ لباس ہو، کھانے ہوں، روایتی بودوباش ہو یا چشموں کا ٹھنڈا میٹھا پانی۔

پوٹھوہار کے لوگوں کا خمیر جس مٹی سے بنایا گیا وہ زرخیز ہے، یہاں کے لوگ اپنی مٹی کی تاثیر لے کر پیدا ہوتے ہیں جو دینے کے فن میں طاق ہے۔ اتنی زرخیز ہے کہ صدیوں سے لوگوں کو بانٹ رہی ہے اور تا ابد دینا ہی اس کا مقدر ٹھہرا ہے۔ نوزائیدہ ضابطوں کی بندش اس کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکی، اسی پس منظر میں ہی طاہرہ اقبال نے اپنا ناول "گراں" تخلیق کیا ہے۔

"گراں" طاہرہ اقبال کا ناول ہے جو 2019ء میں دوست پبلی کیشنز اسلام آباد سے شائع ہوا۔ اس ناول میں انھوں نے پوٹھوہاری ثقافت کو نمایاں کیا۔ ناول کو بنیادی طور پر چار حصوں میں تقسیم کر کے پیش کیا گیا۔ پہلا حصہ 'چواپاک'، دوسرا حصہ 'تاج محل'، تیسرا حصہ 'چودھری محمد اکرم NZD vs' اور چوتھا حصہ 'میری کالی مرغی کھوگئی' کے نام سے شامل کیا گیا۔ ناول میں طاہرہ اقبال نے شروع سے آخر تک خطہِ پوٹھوہار کو پیش کر کے

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

اس کا مقابلہ موجودہ ماڈرن ازم سے کیا۔ ناول کے پہلے حصے "چوا پاک" میں وہ ساٹھ کی دہائی کے پوٹھوہار کے بارے میں لکھتی ہیں، جہاں جذبات سے لے کر مادی ضروریات تک خالص تھی، جہاں کی صبح کے کئی انداز تھے۔

ناول کے کردار جفاکش اور محنتی ہیں، کچھ چکی پیس کر آٹا بناتے، کچھ کھیتوں میں کام کرتے، کچھ محنت مزدوری کرتے، غسل خانے کا رواج عام نہ ہونے کے باعث پانی کے برتن اٹھائے پوٹھوہار کے باسی نشیبی جگہوں میں رفع حاجت کے لیے اتر جاتے خواتین ناشتے کے لیے مکئی جس کی پیداوار میں یہ خطہ خود کفیل ہے کی روٹیاں بناتیں تو دوسری خواتین خالص دودھ کے جمے دہی سے لسی بنا کے مکھن کے پیڑے نکال کر ان روٹیوں پر ڈال کر ناشتے تیار کرتیں اور ایندھن کے طور پر استعمال ہونے والے اپلے جانوروں کے گوبر کو باریک گول شکل میں سکھا کر استعمال کرنا، اس خطے میں کئی دہائیوں سے رائج ہے۔

صبح کی روشنی پھیلنے کے ساتھ ہی مویشی اور مرغیوں کو آزادی مل جاتی جو ندیوں، نالوں اور نشیبوں میں بکھر جاتے۔ پنجاب کا یہ خطہ بھی زرخیز ہے، یہاں کے لوگوں کا ذریعۂ معاش کھیتی باڑی تھا، جس میں مرد اکیلے نہیں ہوتے۔ دن کی شروعات کے ساتھ خواتین چاردیواری کے اندرونی معاملات نمٹا کر زرعی معاملات میں مردوں کے برابر کام کرتی ہیں چاہے وہ مکئی کی فصل سے بھٹے چن کر اس کو خشک زردملفوفہ سے جدا کرنا ہو یا مونگ پھلی کاشت یا چنائی۔ ناول کے پہلے حصے میں ناول نگار خطہ پوٹھوہار کے اس دور کو لکھتی ہیں جب علاقائی زبانیں خالص تھیں۔ اس میں مغربی اور جدید لسانیات کی ملاوٹ نہ تھی۔ مقامی زبانیں اپنے اندر کئی پرتیں رکھتی ہیں۔ زبانوں میں استعمال ہونے والی استفہامیہ علامات پوٹھوہار کا خاصہ ہیں اور ان کی ثقافت کا اہم پہلو بھی ہے۔۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"عمروں کے سنگی ساتھی اک دوسرے دوسرے کو کاٹنے وڈنے لگے۔ ہائے ہائے ظلمی۔۔۔ ہائے ہائے لوٹی۔۔۔"(3)

مصنفہ جذبات کی پختگی، روایات کی پاسداری اور وفاشعاری کو پوٹھوہار کی ریت بتاتی ہیں۔ رومانوی جذبات میں پاکیزگی اس خطے کا خاصہ تھی جس نام سے ایک مرتبہ منسوب کر دیا گیا، اسی نسبت سے لگ کر عمریں گزار دو لیکن اس روایت میں انقلاب ہرگز قابلِ قبول نہ تھا۔ اسی بات کو بنیاد بناتے ہوئے طاہرہ اقبال لکھتی ہیں:

"اس گراں کی وفاشعاری کے تفاخر سے عورتوں کی گردنیں تن گئیں۔ روایات کی پاسداری کا عزم اور حوصلہ مشقتی جھریوں میں لپٹی آنکھوں میں لودینے لگا۔ میلوں نیچے چوے کے پاک پانیوں سے لڑکیاں گھڑے ڈبو کر بھرتی تھیں۔ ہاتھ ڈال پاؤ پاؤ بھر پستئی رنگ مینڈک اور انگلی انگلی بھر چتکبری مچھلیاں باہر نکال واپس چوے میں چھوڑ دیتیں۔ (4)"

یہ اس دور کا پوٹھوہار ہے جب جدید برقی آلات ایجاد نہ ہوئے تھے۔ جدید دور کے مہنگے لانڈری سسٹم سے قبل خواتین گہرے نشیبوں میں قدرتی بہتے پانیوں سے کپڑے دھوتیں اور نتھارتیں۔ اس دور کی حیا اتنی پختہ تھی کہ کپڑوں کو دھونے کے بعد آخر میں تن کا لباس دھو کر اس کے خشک ہونے کے انتظار میں بدن کو دوپٹوں سے ڈھانکا جاتا، مرد اپنی آمد سے قبل آگاہ کرنا ضروری سمجھتے، یہ حیاداری ان کی ثقافت کا حصہ گردانا جاتا ہے۔ پوٹھوہاری خطے کے ماحول کا نقشہ طاہرہ اقبال نے یوں کھینچا ہے:

"بہت نیچے چوے سے گھڑے بھرتی لڑکیاں آواز سے آواز ملانے لگیں۔ چوے میں تین تین پاؤ کے پستئی رنگ مینڈک چھلانگیں لگاتے تھے اور انگلی انگلی بھر مچھلیوں کا پونگر سطح آب پر تڑپتا تھا۔ چوے میں بچھی کائی میں سے پودے پھوٹ نکلے تھے کناروں پر کتھئی جالے لٹکتے تھے جو لمبی جاہنگوں والے مینڈکوں کے ہم رنگ ہم شکل تھے۔ اصغر خان نے چٹان کی اوٹ سے ہانک لگائی۔ "بیبیو چیلا کرو" بازگشت سفید چٹانوں سے ٹکراتی کسوں میں پلٹتی رہی۔"(5)

نسبت سے جڑ کر اسی کا ہو کر رہنا اس مٹی کا خمیر تھا۔ ناول کے کردار رومانوی جذبات سے لبریز لیکن حدود سے متجاوز ہرگز نہیں ہیں۔ انھوں نے ناول میں ایسے کرداروں کو صفحۂ قرطاس پر اتارا جن کی ساری زندگی سراپا انتظار آس ہے۔

شکیلہ جان ان کے ناول کا ایک ایسا کردار ہے جو ساری زندگی انتظار میں گزارتی ہے۔ ہر گزرنے والی ریل گاڑی کا اس قصباتی ریلوے سٹیشن پر استقبال کرتی، اس آس کے ساتھ یہ گاڑی اس کے محبوب کو لا اتارے گی اور ہر دن گاڑی کے گزرنے کے بعد اس کا دل بین بننے لگتا "کدوں مڑ سوکہڑی گڈی توں لہسو" اسی بین کو من ہی من میں بنتے شکیلہ جان اپنا سفر زیست تمام کر دیتی ہے لیکن پوٹھوہار کی ثقافتی ریت میں کوئی ردوبدل یا لرزش نہیں لا پاتی۔ آج کے دور میں یہ ریت اب کوئی نہیں مانتا لیکن یہ تب کی پوٹھوہاری ثقافت ہے، جب ٹیکنالوجی اور صنعت نے ترقی نہیں کی تھی، گاؤں کے سادہ لوح لوگ تھے جو اپنی ثقافتی روایات کی ہر حالت میں پاسداری کرتے تھے اور یہی ثقافت اس کردار کے ذریعے بھی دکھائی گئی ہے۔

ناول کے دیگر کردار بھی اسی طرح کی زندگی گزار دیتے ہیں جو اپنے محبوب کے انتظار کے دیپ جلائے رکھتے ہیں حتیٰ کہ ان کی ساری حیاتی تمام ہو جائے۔ انھی کے ناول کے کردار میں جذبات کی وابستگی اس قدر پختہ ہے کہ اگر محبوب کی زندگی وفا نہ کر پائے تو اس کی قبر کے مجاور بن کر عمر بتا دی جائے۔ وفا کا یہ رنگ پوٹھوہار کی خواتین کا خاصہ ہے۔

پوٹھوہار کی یہ خواتین اپنے ثقافتی رنگوں سے وابستہ اور ان کی گرویدہ ہیں۔ مشقت بھری زندگی کے باوجود ان کے ثقافتی شغف اور فن ان کی روزمرہ زندگی کا حصہ رہے۔ ہاتھوں سے اون کے گرم ملبوسات بنا کر ان کو اپنے محبوب کو زیب تن کروانے میں ان کو لذت محسوس ہوتی ہے۔ کڑھائی کر کے کپڑوں میں اپنے خیالوں کے سلطان کے نام کے ہجوں کو یوں ترتیب دیتی ہیں کہ اس میں ردھم اور تناسب کا توازن برقرار رہے۔ اس خطے کے لوگ کثیر تعداد میں نہیں تھے، چند گھرانے تھے جو مل کر وہاں رہائش پذیر تھے اور یہ خطہ پہاڑی سلسلے سے گھرا ہوا تھا۔ آس پاس بکھرا فطری حسن وہاں کے ماحول کو چار چاند لگائے رکھتا۔ وہاں کے ماحول کی نقشہ کشی کو طاہرہ اقبال یوں بیان کرتی ہیں:

"دس گھرانوں کے اس پہاڑی گاؤں کو چہار اطراف سے لپیٹے مٹیالے پتھریلے پہاڑی سلسلوں کی چوٹیوں جیسے میدانی علاقے ہاں سردی جلا ڈالتی۔ بارش شروع ہوتی تو پانچ چھ روز چوٹیوں کو دھوتی۔ ڈھلانوں سے اُترے ریلے کسوں کھیتوں، ندی نالوں میں موجود نباتات کو ٹھٹھرا کر جھلسا کر مار ڈالتے۔"(6)

پوٹھوہار کی ثقافتی زندگی میں خلوص ضرور ہے لیکن آسائش کی فراوانی دکھائی نہیں دیتی۔ یہاں پر گندم کی بوائی کے دنوں میں گندم کی روٹی میسر نہ آتی یا کم میسر آتی۔ خطے کے ثقافتی اور قدیم کھانوں میں مکئی کی روٹی اور گھر کی لسی اور کھٹا ساگ ہے۔ اسے بڑھ کر خصوصی تواضع میں دیسی مرغ اور بٹیر کا سالن پیش کیا جاتا۔ یہاں کا قدیم ثقافتی میٹھا "حلوہ" ہے جس کی زینت خشک میوہ جات بنتے ہیں جس کا ذکر طاہرہ اقبال اپنی تحریر میں بھی کرتی ہیں۔ حقے تازے کر کے مہمان کی خاطر مدارت کرنا بھی اس خطے کی تہذیب کا خاصہ ہے۔ اس اقتباس سے پوٹھوہار کی ثقافت کے رنگ نظر آتے ہیں، ملاحظہ کریں:

"اس موسم میں جسے گندم کی روٹی اور دال سبزی کا سالن نصیب ہو تا وہ علاقے کا امیر گھرانہ سمجھا جاتا۔ عام گھرانوں میں ساگ کے کنے چڑھتے جس میں لسی ملا کر کھٹا سالن پکایا جاتا لیکن جب کوئی سرکاری اہلکار یا مہمان آتا تو پھر دیسی مرغا بھون کر پکتا اور شوربے والا بٹیر یا تیتروں کا سالن الگ بنتا۔ گندم کے آٹے کے چھلکے اور باداموں کھوپرے والا سوجی کا حلوہ بنتا۔ پوٹھوہار کی یہ عورتیں مرغ پلاؤ پکانا بھی خوب جانتی تھیں۔ سگھڑ سیانی ایسی کہ غریبانہ گزر بسر والے گھرانوں میں سے جب خواں پک کر دستر خوان پر آتے اور حقے تازہ ہوتے، بیٹھکوں میں بستر لگتے تو پنجاب کے جاگیر داروں کی حویلی کے منظر تازہ ہو جاتے۔"(7)

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

ناول کے اس پہلے حصے کو جسے مصنفہ نے "چواپاک" کا نام دیا ہے جس سے مقامی لوگ عقیدت رکھتے تھے۔ گاؤں کی سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی داستانوں کے مطابق ایک مرتبہ حضرت غوث اعظم پاک کا اس چشمے سے گزرا ہوا اور سخت گرمی اور پیاس کی شدت کے باعث پانی نہ ملا، انھوں نے اس پتھر پر عصا مارا تو چشمہ بہ نکلا۔ جھیل اور بکائین سے متعلق بھی اس گاؤں کے لوگ مختلف عقیدت بھرے نظریات رکھتے تھے۔ پوٹھوہاری خطے کے نیک بزرگ کی کرامت کو طاہرہ اقبال نے یوں بیاں کیا ہے:

"آنحضرت غوث اعظم کا گزر ایک باران کسوں میں ہوا، گرمی اتنی کہ سارے کنویں چشمے سوکھ نمک ہو گئے۔ پتھر چقماق بن کر آگ اگلنے لگے۔ کھڑاؤں کے اندر تلوؤں میں چھالے پڑ گئے۔ پیاس لگی دور دور تک نہ پانی نہ آبادی، عصا پتھروں پر جو مارا ہے تو یہ چوا ابل پڑا۔ پانی پیا پھر ادھر نیچے عصا پھینکا تو یہ جھیل بہہ نکلی۔ وضو کیا، ان جلتے ہوئے پتھروں پر نماز ادا کی تو یہ بکائین اگ آئی۔ لو وہ دن اور آج کا دن، چاہے سارے پوٹھوہار کے پانی خشک ہو جائیں۔ ساری جھیلیں چشم برف بن جائیں، سورج سارے پانی چاٹ لے جائے لیکن یہ چوا یہ جھیل کبھی نہ سوکھے۔"(8)

بلاشبہ قدرتی ذرائع آب سراپا شفا ہوتے ہیں۔ اسی مذکورہ چوے کا پانی اپنی ذات میں بے شمار خوائص رکھتا تھا۔ اسی شفاف اور صحت افزا پانی کی تاثیر مانی جاتی تھی جس نے کبھی اس گاؤں کے کسی فرد کو کسی موذی مرض سے دوچار نہ دیکھا۔ صحت اتنی بہترین کے اسی نوے سال کے لوگ بھی مشقت والا کام بخوشی کر لیتے۔ اسی عقیدت مندی کی بدولت وہاں کے لوگ کردار کی آلائشی سجاوٹ سے بے باک، مخلص اور بے ریا تھے۔ یہی مخلصی اور بے لوث جذبات خطہِ پوٹھوہار کی ثقافت اور مٹی کا خاصہ ہیں۔

مذکورہ ناول 'گراں' میں طاہرہ اقبال سادگی اور یکجہتی کی ہر جہت کو لکھتی ہیں اور ثقافتی عناصر کو پیش کرتی ہیں۔ سارے گاؤں کے لوگوں کے کپڑے لانے کا ذمہ، اناج لانے کا ذمہ گاؤں کی دوسری ساری ذمہ داریاں ایک مخصوص فرد کے سپرد تھیں۔ تب اجتماعی سوچ ہوتی تھی یہ امر پوٹھوہار کی ثقافتی رواداری کی آئینہ داری کرتا ہے۔ کسی کی پریشانی ذاتی نہ تھی اور نہ ہی کسی کی خوشی انفرادی تھی۔ مشکل دنوں میں اناج کو مل بانٹ کر استعمال کیا جاتا اور خوشحال دنوں میں اس سے حق داروں کا حق دیا جاتا۔ مرگ ماتم کو مل بانٹ کر نمٹایا جاتا اور شادی بیاہ کے گیت ہوں یا علاقائی خصوصیت کے حامل پکوان، اکھٹے بنائے اور بانٹے جاتے۔ پوٹھوہاری گھرانوں کی ثقافت کو طاہرہ اقبال یوں بیان کرتی ہیں:

"اس گراں کے سارے دس گھرانوں کے کپڑے لتے سودا سلف صوبیدار حکم داد ادھر ساگری یا پھر روات سے خرید کر لاتے۔ گھر گھر جا کر مردوں عورتوں کی گنتی کرتے، ضروریات پوچھتے اور فہرست بنا لیتے۔ نہ کبھی کسی نے اعتراض

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

کیا نہ نقص نکالے۔ جب سے ساگری گراں میں جندر لگی تھی، پورے گاؤں کی گندم، باجرے، مکئی کی پسوائی کی ذمہ داری چاچا قیوم کے سپرد تھی۔ سارے گھروں کے لڑکوں کو روات سکول چھوڑنے لانے کا ذمہ تایا امانت خان کا تھا۔ یہاں ہل بیل، گیس لالٹین، بستر، بستر بند، بیگ بکسے پلیٹیں، گلاس، بیٹھکیں، ترپال کچھ بھی ذاتی یا نجی نہ تھا، سب کا اجتماعی استعمال تھا۔ آج کل قحط سالی کے دن تھے۔ اسی لیے ماما نذر محمد ہر گھر میں پتہ کرنے جاتے، کہیں اناج کی تھوڑ تو نہیں اور جہاں کمی نظر آتی تو ایک ایک بٹھل ہر گھر سے اکٹھا کر کے وہاں چھوڑ کر آتے۔"(9)

پوٹھوہاری خطے میں انسانی زندگی اہم تھی، جس کے ضیاع پر صفِ ماتم بچھتی تو چالیس روز بچھی رہتی۔ ایک گھر کے دکھ کو گاؤں کا ہر گھر اپنی ذات کا سوگ تصور کرتا تھا۔ تب دکھ سانجھے تھے۔ پوٹھوہار میں جدید مشینری کے ایجاد سے قبل گندم کی کٹائی ہاتھ سے ہوتی اور اس کی بالیوں میں زرد گندم کے دانے نکالنے کا کام طاقت ور بیلوں کی مدد سے ہوتا۔

خطہ پوٹھوہار کی ثقافت میں گندم کی کٹائی اور گاہی کا کام ایک تہوار کی طرح منایا جاتا۔ سارے علاقے کی گندم ایک جگہ جمع کر کے مل کر کام کرنے کے رواج کو نبھاتے۔ سب کی گندم کو ایک ساتھ گاہ کر اس کی گندم کے دانے اور بھوسہ الگ کرنے کا کام بلاشبہ مشقت سے بھرپور تھا۔ اس موقع پر مقامی کھانوں کا اہتمام اس علاقے کی تہذیب کا خاصہ تھا۔ بزرگ اور بڑی عمر کے افراد اس موقع پر اس تہوار نما مشکل کام کو انجام تک پہنچتے دیکھتے۔ مشقت سے بھرپور کام کرنے والوں کی خوراک بھی طاقت ور اور دیسی ذائقوں سے بھرپور تھی۔ طاہرہ اقبال وہاں کے کھیتوں کھلیانوں میں ہونے والے کام کی منظر کشی کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

> "ان دنوں گندم کی گاہی ہو رہی تھی سجے ہوئے جیوے اور پنجالیوں والے بیلوں کی جوڑیاں اکٹھی ہوئی تھیں۔ موہڑے۔۔۔ گوڑھے، تھلے، نگیے، پرتھے، کرپال، پھڈے بیسوؤں گراؤں سے بہترین بیل آئے تھے اور ڈھول اور گھنگھروؤں کی آواز پر پڑ (کھلیان) گھاہ رہے تھے۔ بزرگ سروں پر مشہدی لنگیاں اور قراقلی ٹوپیاں جمائے پھلاہیوں، دھریکوں کی چھاؤں میں بیٹھے بیلوں اور نوجوانوں کو ہلاشیری دیتے تھے۔ بچے اور نوجوان کھڑاؤں اور فوجی بوٹ پہنے کھلیان پر دائروں میں گھومتے تھے۔ ہر گھرانے میں کوئی نہ کوئی فرد فوج میں رہ چکا تھا۔ اس لیے فوجی بندوق، فوجی بوٹ اور جیکٹ ہر گھرانے کا اعزاز تھا۔ ہر گھر کے صفے یعنی بڑے کمرے میں کھونٹیوں یا کیلوں سے سجاوٹوں کی طرح یہ اعزازات سجے رہتے تھے۔"(10)

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

اس اقتباس میں خالص پوٹھوہار کی ثقافت کی عکاسی اور مقامی بولی کے الفاظ کا استعمال ملتا ہے۔ اس خطے کی عورت کا فلسفۂ حیات وفا تھا اور ان کا خمیر انتظار اور صبر سے گوندھا گیا تھا۔ اگر ان میں سے بھولے بسرے کسی سے کوئی ایسا کام سرزد ہو جاتا جو اس خمیر کی سرشت سے میل نہ کھاتا ہو تا باقی لوگوں کے لیے یہ معمول کا کام کچھ ایسا غیر معمولی اور انہونہ ہو تا کہ کئی کئی دنوں تک اس پر افسوس اور ماتم کیا جاتا۔ ایک دفعہ کے جڑے ہوئے تعلق کو پھر توڑنا اسی 'گراں' کے لوگوں کے لیے ناممکن نہ سہی لیکن انہونہ عمل تھا۔

یہاں کے لوگوں نے اپنے آبائی طرز بود و باش سے بغاوت اس وقت کی جب انھوں نے محسوس کیا کہ اب آبائی زمینوں کی کاشت کاری کو چھوڑ کر نئی دنیاؤں کو دریافت کرنا چاہیے کہ ترقی کے سارے راز تو ولایت میں رکھے ہیں۔ سرحدوں کو پار کرنا ہی اپنی معاشی اصلاح کا واحد ذریعہ سمجھا جانے لگا۔ اس گاؤں کی صدیوں پرانی تاریخ میں کراس پڑا وگرنہ اس سے پہلے خطہ ہائے پوٹھوہار کے باسی اسی پر رب کے صد شکر گزار تھے کہ جس نے ان کی مٹی کو سونا اگلتی زرخیزی بخشی۔ مٹی سے محبت اس دھرتی کے باسیوں کے خمیر میں گندھی تھی۔ اس لیے یہ مٹی بھی ان سے وفادار تھی۔ ان کے معاش میں مددگار ہوتی یہ مٹی بھی ان پوٹھوہاری باسیوں سے مانوس تھی۔ جو تھوڑی محنت کرنے پر بے پناہ پھل عطا کر دیتی۔ اس خطے کی ثقافت معمولات اور سخت گیر حیات میں سے راحتیں کشید کرنے کے فن کی ترغیب دیتی ہے۔ مشترکہ ملکیت کے اصول نے یہاں سب کچھ اجتماعی بنا دیا تھا حتیٰ کہ بچوں تک کو ہر کسی پر دعویٰ تھا۔ روزمرہ زندگی مشکل ضرور تھی لیکن پر لطف تھی۔

طاہرہ اقبال کا ناول "گراں" کسی ایک فرد کی کہانی نہیں بل کہ یہ پورے علاقے کی داستان ہے۔ وہ اپنے ناول میں پوٹھوہار کے اس پہاڑی گاؤں کے نشیبوں کی داستان لکھتی ہیں۔ وہ مڑتے بل کھاتے سنگلاخ پہاڑی راستوں کو صفحۂ قرطاس پر اتارتی ہیں۔ ٹھنڈے میٹھے پانیوں کی تاثیر بیان کرتے ہوئے وہ اس زرخیز مٹی کا مزاج بھی قاری کے لیے محفوظ کرتی ہیں۔ وہ یہاں کے مرد و خواتین دونوں کی وفاشناسی کو لکھتی ہیں۔ یہاں کی ثقافت انتہائی تاب ناک ہے جس کی تصویر کشی انھوں اپنے ناول میں یوں کی ہے:

> "اس گراں میں نہ کبھی کوئی موذی مرض پھیلا نہ بیماریاں لگتیں۔ اسی نوے سال کے بڈھے بھی ایک سانس میں کس چڑھتے اور ہل جوتتے تھے۔ نہ کبھی لڑائی جھگڑا، نہ حسد نہ کینہ، اسی پانی کی برکت سے تو۔۔۔ چھوٹے بچوں کو تو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ سگا ماں باپ کون ہے سارے تائے چاچے مامے، پھوپھڑ باب بجا۔ جس سے چاہیں شیرینی کا پیسہ

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

دھیلا، آنا دوانی مانگیں۔ جس سے چاہیں سکول کی فیس لے لیں۔۔۔ جس گھر میں چاہیں کھانے پر جا بیٹھیں، جو چیز ضرورت ہو پوچھے بنا اٹھا لیں۔"(11)

میلوں پیدل چلنا کسی کے لیے بھی اجنبی نہ تھا۔ جدید طرز کی مہنگی گاڑیوں کا کوئی تصور نہ تھا۔ در حقیقت یہ ثقافتی طرز بود و باش ہی اسی علاقے میں لوگوں کے اجتماعی خاندانی نظام کے تصور کی وجہ تھی۔ روز مرہ کے کاموں کے لیے اپنائیت کی شیرینی یہاں کی ثقافت کی دین تھی۔

طاہرہ اقبال مذکورہ گاؤں میں حیا داری کی پابندی کے ساتھ رومانوی جذبات کی سطح کو باور کراتی ہیں۔ انتہائی مشقت سے بھرپور زندگی میں بھی رومانوی مگر پاکیزہ جذبات بدرجہ اتم موجود تھے۔ ان جذبات میں یکتائی اور یکسوئی کے عناصر کا خیال حد درجہ تک رکھا جاتا۔ شرک کی کوئی گنجائش ہرگز نہ نکلتی تھی۔ یہ پوٹھوہار کی ثقافت کی دین اور یہاں کے خمیر کی تاثیر ہے کہ وفا کے نام پر عمر گزار دو لیکن محبوب کی ہم سری کا رتبہ کوئی دوسرا نہ پا سکتا تھا۔ اس نہج پر جب صِنفِ نازک کو آزمایا گیا تو وہ کامیاب ٹھہری لیکن یہ تاثر بھی نہ چھوڑا گیا کہ مرد کسی سے پیچھے ہیں۔ یہی جذبات اس خطے میں یکجہتی کی وجہ ہیں۔

ناول نگار تحریر میں قدیم پوٹھوہار سے جدید کی طرف گامزن خطے کے حاصل و لاحاصل کو لکھتی ہیں۔ بے ریا، بے لوث، منافقت سے پاک، پاکیزہ جذبات کا حامل یہ پوٹھوہار اب جدت کا متلاشی ہے۔ یہاں جب عالم گیر دنیا نے اپنے قدم جمانے شروع کیے تو آگے نکلنے کی دوڑ یہاں خود غرضی لے آئی اور اِسی خطے کے باسی اپنی ثقافتی اقدار سے بغاوت کرنے لگے۔ جدید تعلیم نے قدیم پوٹھوہار کی تہذیب و ثقافت کو تہ و بالا کر دیا۔ بیرون ممالک سے بھیجے گئے زرِ مبادلہ نے یہاں کی مشقت بھری زندگی کو کافی حد تک آسان بنا دیا۔ دستی کاموں میں آسانی کے لیے برقی آلات آ گئے۔ پیدل چلنے کے بجائے اپنی گاڑیوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ دیسی مصنوعات اور خالص خوراکوں کے بجائے اب پوٹھوہار کے دستر خوان اب غیر ملکی کھانوں سے سجتے گئے۔ بیرون ممالک سے آئی گاڑیوں کو دیکھنے گاؤں کے لوگ دور سے آئے کہ یہ اس خطۂ پوٹھوہار میں نئی ریت تھی۔ وہاں جہاں کے لوگوں کو پیدل چلنے کی عادت تھی۔ جہاں لوگوں کو مقامی شہر تک رسائی کے لیے سواری میسر نہ ہوتی تھی وہاں ذاتی گاڑی کا تصور بھی محال تھا۔ کجا یہ کہ نئی مہنگی چمچماتی کار کا ہونا۔

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

اس عہد کی ضرورت کے مطابق لوگوں نے طرزِ زندگی اختیار کر لیے۔ اس خطے کی ثقافت جسے یہاں کی مکینوں نے سینت سینت کر رکھا۔ ہر میدان میں اس کی پیروی کی، ہر مشکل میں اس کی روشنی میں حل تلاش کیے۔ ہر غم، ہر آسودگی میں ثقافت کا دامن تھام کر رکھا۔ آج دم توڑتی نظر آ رہی ہے یکجہتی کی آڑ میں اجارہ داری کے علم برداروں نے یک رنگی ثقافت کے نفاذ سے علاقائی ثقافتوں کو مات دے دی ہے۔ اب ان مقامی تہذیبوں پر مغرب پسندی اور جدت کی تمنا نظر آتی ہے۔

ناول کے دوسرے حصے کا نام "تاج محل" ہے۔ وہ تاج محل جو صدیوں سے پاکیزہ بے لوث محبت کا باقی رہ جانے والا انمٹ نقش ہے۔ جس کے در و دیوار پر محبت کی داستانیں درج ہیں۔ اس تاج محل کا امیں، آگرہ کا باسی اپنی مقامی سرشت ترک کر کے جدید انگریزی دنیا کے اطوار اپنالیتاہے۔ غزل جان اپنی مشرقی فطرت کی بدولت اس سے پاکیزہ جذبوں کا تقاضا کرتی ہے، جن سے آشنائی تو کہیں آگرہ میں ہی رہ گئی تھی۔ یہاں جو بھی آتا ہے، تہی دست رہ جاتا ہے۔

یہ وہ دور ہے جب اس گراں کے باسی پوٹھوار کی ثقافت سے روگردانی پر قائل ہوئے۔ غزل جان جس کے خمیر میں رسمِ وفا کی پاسداری ہے لیکن بدلتی دنیا کے متغیر تقاضے اسے مغرب کی راہ دکھاتے ہیں۔ جہاں اسے تاج ملتا ہے۔ وہ اپنی پوٹھوہاری ثقافت کے زیر اثر اس میں پاکیزہ جذبوں کی متلاشی ہے۔ لیکن تاج جو بھارت نژاد تھا۔ اس پر مغربیت اپنی پوری آب و تاب سے اپنے پنجے گاڑ چکی تھی۔ وہ غزل کو بھی اس کریہہ صورت ثقافت میں ڈوبنے کی دعوت دیتا ہے لیکن پھر مشرق کی تہذیب آڑے آتی ہے۔ وہ وہاں سے بھاگ نکلتی ہے۔ لیکن اس کی یادوں میں تاعمر یہ شخص "تاج" کے نام سے زندہ رہتا ہے۔ ناول میں آگے چل کر دوسرے حصے میں مصنفہ، تہذیب یافتہ ثقافت سے روگردانی اور بد تہذیبی جو جدت میں ملفوف ہے کی کریہہ صورت سے پردہ اٹھاتی ہیں جو غزل جان کی طرح کے کئی لوگوں کو "تاج" کے روپ سے ٹکراتا ہے اور رہتی زندگی تک اپنی چھاپ چھوڑ دیتا ہے۔ غزل جان اور اس جیسی دیگر کئی عورتوں کی کیفیت کو طاہرہ اقبال یوں بیان کرتی ہیں:

> "اک عجب احساس نے اسے مات دے دی تھی۔ وہ جو تاج کی سرزمین کا پروردہ تھا۔ اسے کیا معلوم کہ یہ جذبہ پنڈی کے اس گراں کی سرخ مٹی کے لہو سے، چوے کے شفایاب پانیوں سے، دھریک کے جھنڈ سے، منتوں بھری دعاؤں سے گچ ہو یورپ کے اس ٹھنڈے ملک میں آکر غزل جان سے لپٹ گیا ہے پر وہ تو محبتوں کا سند یافتہ ہے۔ تاج کا پروردہ ہے۔ غزل جان عجب احساس کمتری کا شکار ہوئی۔ اسے تو تاج محل جیسی سرشار محبتوں کی سیرابی حاصل تھی لیکن یہ گراں واسن تو ذرا سے چوے، ذرا سے گاؤں کو گھیرے پہاڑی حصار میں گمنام۔۔۔ پر یہ گراں واسنیں تو جس

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

وجود کا سرت ایک بار خود پر پھونک لیتی ہیں، بس پھر اسی سحر میں بستی ہیں۔ اسی من سمندر میں قطرہ قطرہ ہو کر رڑھ جاتی ہیں۔"(12)

یہ اس دور کی ابتدا ہے جب پوٹھوہار میں نئی اقدار نے جنم لیا۔ ثقافتی عوامل کو ترک کرنے کے رجحان نے نمو پائی۔ پیدل رستے ویران ہوئے۔ برساتی جھیل میں کپڑے کوٹتی، نتھارتی عورتوں کی نسل نے رخصت چاہی۔ آنے والی نسل اس پوٹھوہاری ثقافت کا بار مزید اٹھائے پھرنے سے انکاری ہوئی۔ انتظار کی آس ریل گاڑی کی آمد پر کوئی غیر معمولی تاثر نہ ابھرتا۔ گندم کی بوائی اور کٹائی کے بارونق ہجوم اب نہ لگتے۔ مونگ پھلی کی کاشت کم ہو کر رہ گئی تھی گویا اس خطے کے لوگوں نے اپنی مٹی سے بدعہدی کر ڈالی ہو۔ اس سونا اگلتی مٹی کا ضیاع معمول بن گیا کیوں کہ اب پوٹھوہار کے بیشتر مرد ولایت سدھار گئے۔ جہاں کی آمدن ان روایتی طریقوں کو ترک کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس آمدن سے اسلام آباد میں کوٹھیاں تعمیر ہوئیں جن کے بھاری کرائے ان کی نوجوان نسلیں وصول کرتیں۔ اب پوٹھوہار میں جدید واشنگ مشینیں آ گئیں تھیں، جنھوں نے کسوں کو ویران کر دیا تھا۔ اب ہر گھر میں پانی نل میں آتا تھا۔ آبِ شفا کا امین چشمہ اب کوئی استعمال نہ کرتا تھا۔ فریج نے مٹی کے گھڑوں کا استعمال ختم کروا دیا تھا۔ ان تبدیلیوں نے ان کی سوچ، روایات، شوق، پسند و ناپسند حتیٰ کہ ثقافتی ورثے کو بھی بدل کے رکھ دیا تھا۔

اس گاؤں میں اب تعلیم عام ہو چکی تھی، لڑکیاں پڑھ لکھ گئی تھیں۔ تعلیم نے ان کو خودارادیت کا جو شعور بخشا، اسی کے نتیجے میں غزل جان نے گاؤں سے اس وقت یورپ کے لیے قدم باہر نکالا جب اس کی بدائی کا دن تھا۔ یوں اس کی ملاقات جسی برکور اور اس کی بیٹی ہارٹ کور سے ہوئی۔ ان کرداروں کی مدد سے طاہرہ اقبال نے مغربی ممالک میں موجود برصغیر کے باشندوں کے ثقافتی حالات کے متعلق لکھا۔ یہ دیسی لوگ آدھے تیتر آدھے بٹیر کے مثل یہاں آ کر بس گئے لیکن ان غیر دیسوں میں اپنے بچوں کو اپنی ثقافت سے ملحق رکھنے کے آرزو مند تھے۔ یہ لوگ یہاں کی تہذیب میں ضم نہ ہو سکے اور اپنے 'گراں' سے ہجرت کر کے وہاں کی تہذیب کو بھی خیر باد کہ دیا۔ اب یہ لوگ اپنی ثقافت کو ترس رہے تھے، وہ یاد کرتے تھے اپنے گراں کے وہ سنہری دن جب محبت خلوص کے رشتے تعلق استوار تھے اور اب ہر کوئی اپنے آپ میں مگن ہو گیا۔ کسی کو کسی کی پرواہ نہیں رہی، مطلبی تعلق اب بنتے ہیں اور اسی پل ٹوٹ بھی جاتے ہیں، ہر طرف مفادات کی جنگ جاری ہو گئی ہے۔

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

ناول کے تیسرے حصے میں طاہرہ ایک دیسی اور جدت کے پیروکار شخص کا موازنہ کرتی ہیں۔ اس حصے کا نام چودھری محمد اکرم NZD vs ہے۔ نذیر احمد جو یخ بستہ وطنوں کو سدھار گئے اور NZD کہلانے لگے، وقت نے ان کو سن کے شعبے میں بے پناہ کامیابیاں اور عزتیں دیں۔ وہ اپنی فیلڈ میں کامیاب ترین انسان رہے لیکن جیون ساتھی کے انتخاب میں وہ اپنی ثقافت کا دامن چھوڑ بیٹھے اور غیر ملکی بیوی اور اس کے بچے بس ان کا ساتھ ان کی شہرت کے خاتمے تک ہی نبھا سکے۔ عمر کے آخری حصے میں انھیں ان برفیلے خطوں نے نہ قبولا، جہاں کی تہذیب زائد العمر بزرگوں کو بوجھ بنا دیتی ہے۔ ایسے میں انھیں اپنا پوٹھوہار پر ہر لحاظ سے یاد آیا ۔چودھری محمد اکرم ان کے ناول کا ایک ایسا کردار ہیں جن کے ذریعے وہ خطہ پوٹھوہار کے اثرات کو قاری کے مطالعہ کے لیے پیش کرتی ہیں۔ چودھری محمد اکرم دیہی تہذیب کے پیروکار کردار ہیں۔ وہ دونوں کرداروں کا موازنہ کرتی ہیں۔ مغرب کی ثقافت ان مشرق زادوں کو کبھی بھی قبول نہیں کر پاتی۔ یہ مشرقی باشندے ان کے لیے قابلِ نفرت، کم نسل، جاہل اور ذات کے حقیر ہوتے ہیں ۔ان کے طور اطوار، بود وباش، طرزِ معاشرت، زبان و بیان، ان کے رنگ و نقوش ان برفیلے کرداروں کے لیے اجنبی اور قابلِ تحقیر ہیں۔

یہ مہاجرین اپنے وطنوں کو ترقی کی تلاش میں خیر باد کہ آئے اور غیر دیسوں نے ان کے انضمام کی اجازت نہ دی۔ اپنی مشرق کی خوبیوں کو وہ چھوڑ بھی دیں تب بھی حاشیے کے دونوں اطراف موجود معاشرتیں ان کو قبول نہ کر پائیں گی۔ ناول کے کردار NZD بھی ہمیں ایسی صورتِ حال سے دوچار نظر آئے۔ نذیر احمد پی ایچ ڈی ڈاکٹر اور یونی ورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر تعینات ہوئے۔ شادی عیسائی لڑکی سے کی شادی کے موقع پر چرچ اور مسجد دونوں کی رسوم ادا کیں۔ مذہب کے معاملات میں دونوں نے کبھی دخل اندازی نہ کی۔ بچوں کے متعلق فیصلہ یہ ہوا کہ اپنی سمجھ کے مطابق وہ جو چاہیں، مذہب اپنا سکیں گے لیکن NZD اپنی پوٹھوہاری ثقافت سے مکمل طور پر دستبردار نہ ہو سکے۔ ان کی سرشست میں وفا بدرجہِ اتم موجود رہی۔ مغربی معاشرت ان پر مکمل پنجے گاڑنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اسی وجہ سے ان کی بیوی نے اپنی راہیں جدا کرنے کا فیصلہ کیا۔

بچے بھی جب جوان ہوئے تو اپنے پروں کو سہارا سمجھا تو آزاد فضاؤں میں اڑان بھر گئے۔ اب بڑھاپے کی تنہائی نے ان کو وطنوں کی یاد شدت سے دلائی۔ دوسرے پلڑے میں موجود چوہدری محمد اکرم کا کردار NZD کی بے بسی، لاچاری اور باطنی اذیت و کرب کو نمایاں کرتا ہے۔ دونوں کردار بچپن کے ساتھی اور لنگوٹیے تھے لیکن دونوں کی چاہتیں جداگانہ۔

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

NZD کے برعکس چودھری اکرم میٹرک سے آگے تعلیم حاصل نہیں کر سکے۔ اپنی مٹی سے پیوستہ رہے۔ اپنے لوگوں پر اپنی خدمات لٹائیں اور بدلے میں ان کو تکریم و وقار سے نوازا گیا۔ ان کے بچے خاندان اور پورے علاقے نے انھیں معزز اور باوقار شخصیت بنادیا۔ وہ وقتاً فوقتاً نذیر احمد کو خطوط لکھتے اور گاؤں کے حالات سے آگاہ رکھتے لیکن انھوں نے اپنی ذاتی مصروفیات اور دیہی زندگی میں عدم دل چسپی کے باعث کبھی ردی کاغذوں سے زیادہ اہمیت نہ دے سکے، نہ کبھی کسی کا جواب دیا۔

اس ناول 'گراں' کے کرداروں میں تقابل پیش کیا گیا ہے۔ چودھری محمد اکرم اپنی ثقافت سے رابطہ استوار رکھے رہے، اپنی محنت کو رفاہی کاموں میں صرف کیا۔ گاؤں کے مسائل کو حل کرنے پر ان کی توجہ رہی۔ ان کی حیثیت مستحکم اور قابلِ عزت و وقار ہوتی گئی۔ وہ سماجی سطح پر اپنے علاقے کی قابلِ ذکر شخصیت ہوتے گئے۔ انھوں نے اپنے مذہب، ثقافت اور تہذیب کا دامن کیسے بھی حالات میں نہ چھوڑا اور وہ اپنے اہل و عیال کے ہمراہ خوش تھے، ان کی زندگی میں کوئی تشنگی نہ تھی۔ نذیر احمد نے اپنی محنت قابلیت ایک ایسی قوم اور خطے پر لٹائی جو رسمِ وفا سے آشنا نہ تھے جن کا دستور محض وصول کرنا ان کی سرشت میں خدمات کا صلہ دینا کبھی نہ رہا۔ وہ اپنی بیوی سے مضبوط تعلق رکھ سکے نہ بچوں سے وہ تعلق رہا جس کا متقاضی یہ رشتہ ہے۔ اپنے آبائی علاقے اور خاندان کو پہلے سے خیر باد کہ کر جا چکے تھے۔ بہت عرصہ پہلے گاؤں کو خیر باد کہنے والے NZD دوبارہ گاؤں جانے کا سوچنے لگے، انھیں دوبارہ اپنی تہذیب کی آغوش ہی مناسب لگی جس میں جا کر وہ اپنے سارے خساروں کا خمیازا بھگت سکیں۔ وہ گراں جہاں مٹھیں رکھ کر نذیر احمد کا انتظار یوں کیا جاتا جیسے اسے یورپ سے نہیں بل کہ دوسرے شہر سے آنا ہو۔ جہاں کے گاہوں کے بیلوں کے احوال سے لے کر گاؤں کے میلوں میں آنے والے بازی گروں کے فن تک کو اس کے گوش گزار کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا لیکن نذیر احمد نے اس کو قابلِ توجہ نہ جانا۔ اب جب کہ وہ واپس اس کی آغوش کے سکون کا طالب تھا لیکن زندگی نے اسے یہ موقع نہ دیا۔

ناول کا آخری حصہ "میری کالی مرغی کھو گئی" کا نام لیے ہوئے ہے۔ ناول کے اس آخری حصے میں مشرقِ وسطیٰ اور سعودی عرب کی تہذیب و تمدن اور یہاں عارضی طور پر مقیم پاکستانیوں کی صورتِ حال کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ خطہ دنیا جہان کے مسلمانوں کے لیے منفرد عقیدت رکھتا ہے۔ پاکستانی اور ان کی طرح کے کئی تیسری دنیا کے ممالک سے آئے ہوئے باشندے عمرے یا حج کے لیے آتے ہیں اور ادھر ہی پناہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔ کم اجرت میں مزدوری کرتے ہیں۔ پولیس کے چھاپوں میں پکڑے جاتے ہیں، کچھ

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

جیلوں میں ہی رہتے ہیں، کچھ کو وطن واپس روانہ کر دیا جاتا ہے۔ "کفیل" نام کی جونک، اقامے کے انتظار میں ان غیر ملکیوں سے اپنی خوب خدمت کرواتا ہے لیکن خوف کی تلوار سر پر لٹکتی رہتی ہے۔ اسی کردار کے بارے میں طاہرہ اقبال یوں رقم طراز ہیں:

"بھاوی برکت تو بہت ہے پر یہ کفیل کسی جلم کی طرح لہو چوس لیتے ہیں یاد ہے نا بھاوی کسوں کے پانیوں میں کتنی جلمیں (جونکیں) ہوتی تھیں، جو بھینسوں کے تھنوں سے چمٹ جاتی تھیں۔ جب تک لہو چوس چوس کر پیٹ پھولا نہ لیتیں الگ نہ ہوتی تھیں، جتنا کھینچو، در ھوئ۔۔۔ بالکل اسی طرح یہ عربی کفیل بھی ہے۔۔۔"(13)

خطہ پوٹھوہار کی فطرت میں دیناہی ہے۔ جو بھی آتا جھولیاں بھر بھر لے جاتا ہے۔ ان زمینوں پر خدا کا اتنا کرم ہے کہ یہاں کچھ نہ اگانے کے باوجود سال کے تمام مہینوں میں یہاں ہر چیز دستیاب ہوتی۔ یہاں آنے والے تمام لوگوں کی نظر کچھ مانگنے پر ہوتی اور انھیں حسبِ منشاعطا کیا جاتا۔ وہاں کی زمین کی زرخیزی اور سونا اگلتی زمینوں کے بارے میں طاہرہ اقبال نے لکھا ہے:

"خدا نے ان زمینوں کو اتنا نواز دیا ہے کہ ہر ایک بخشش وصول کرنے کے واسطے چلا آتا ہے۔ ثواب کی صورت کہ خیرات کی صورت بخشش وصولنے کا ذہن بنا کر آتا ہے۔ اُن کی گاڑیاں، کوٹھیاں، کاروبار، بینک بیلنس جس خزانے کی عطا ہے اس کا منبع اسی سرزمین سے پھوٹتا ہے تو پھر مانگنے میں بخشش وصول کرنے میں عار کیسی۔۔۔ یہ عورتیں تو پھر جس کی دیوانی ہیں، اُس سے سب چھین بھی لینا چاہتی ہیں۔ چاہے وہ مردہ، جس کی چھاپ دل اور بدن پر کندہ ہو چاہے بنی جی کا در ہو کہ کعبہ کا غلاف ہو۔ چھوڑتی نہیں ہیں، پھر ان زمینوں کو برکت کی دُعا ہے کہ کچھ ختم ہوتا ہی نہیں ہے۔ ثواب ہو کہ غذا ہو ہمیشہ جاری رہنے والا چشمۂ فیض ہے۔"(14)

یہاں ان ملکوں میں شہریت کے قوانین سخت ہیں۔ ادھر نسلیں گزار دیں عمریں بتا دیں لیکن یہاں کی شہریت نہ حاصل کر سکیں گے۔ ان تمام مشکلوں کے باوجود اس خطے سے خاص دلی رابطہ رہتا ہے۔ یہاں رہنے والے مسلمانوں میں بھائی چارہ ہے جو وطنوں میں مفقود ہوتا ہے۔ دراصل یہاں بھائی چارہ قائم کرنا ان کی بقا کی مجبوری ہوتی ہے۔ ان تمام مصائب کو قبول کرنے کے بعد بھی یہ غیر ملکی اس ثقافت میں انضمام نہیں حاصل کر پاتے۔ وہ پھر بھی غیر ملکی پناہ گزیں، مہاجر، حاجی کہہ کر نکال باہر کیے جاتے ہیں۔ عثمان خان کا بھائی اور سار یہ جان وہاں مقیم ہیں۔ جن کے مہمان غزل جان اور اس کا خاندان ہیں۔ یہیں عثمان خان کی موت واقع ہوتی ہے اور اس کی قبر کا کتبہ قبرستان کی تمام پرانی قبروں سے منفرد اور اونچا ہوتا ہے۔ غزل جان بھی اپنی ثقافتی روایات کے سنگ

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

چلتے اس کتبے سے لگ کر عمر بتا دینے کا عہد کرتی ہے لیکن اب عہد بدل چکے ہیں تہذیبوں نے نئے رخ بدل لیے ہیں اب زندگی اتنی مصروف ہے کہ اس میں کتبوں کے لیے گنجائش نہیں نکلتی۔ وہاں کے قبرستان کی صورتِ حال کو طاہرہ اقبال یوں بیان کرتی ہیں:

"زرینہ جان کے حوالدار کی قبر ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ اس کا اونچا تعویذ اوندھا گیا تھا، لیکن زرینہ جان کی اس سے وابستہ شناخت ابھی بھی باقی تھی۔ امیر جان کے کپتان صاحب کی قبر ابھی قائم تھی کہ وہ شہید کی قبر تھی، جسے ابھی بھی فوجی دستہ سلامی پیش کرنے آتا تھا اور اس کی حفاظت کا بندوبست کر جاتا تھا۔ صنوبر جان کی قبر تو زنانہ قبر تھی، اس کی بے شناختی میں ہی عورت ذات کی توقیر تھی۔ اس کی بنیادیں مضبوط رکھی گئی تھیں کہ کہیں بارشوں، طوفانوں ،زلزلوں میں ننگی نہ ہو جائے۔"(15)

وہ خطہ جہاں کی ثقافت میں وفا تھی اس وفا کو نبھاتے نبھاتے اس پوٹھوہار کی خواتین اپنی عمریں گزار دیتیں لیکن بے ثمر رہتیں۔ اسی بے سروسامانی کا حساب چلتا کرنے غزل جان نے عثمان خان سے نکاح کا ناطہ جوڑا۔ تمام عمر وہ اس کے قریب نہ پھٹکی لیکن اس کے مرنے کے بعد وہ بھی پرانی سنت کے مطابق اس کے کتبے سے وقت گزارنے لگیں، پھر اسے اس کے انگریزی نیشنل سپوت نے آکر اس عمل سے روکا جو اپنی قیمتی عمر اور برٹش پاسپورٹ کو برباد ہرگز نہ کر سکتا تھا۔ اسی موضوع کو طاہرہ اقبال نے یوں بیان کیا ہے:

"آپ دونوں ویسے کون سا اتنے قریب تھے ماما! تمام عمر تو آپ کو آپوزٹ دیواروں میں گھسے دیکھا۔ اب دنیاداری کی حد حاصل کر لی۔۔۔ آپ کی سائیکولوجیکل پرابلمز پر ہم اپنا Future تو Sacrifice نہیں کر سکتے نا۔۔ کپڑے نوچ لینے والا وہ تاج کہیں دانت نکالے قریب ہی کھڑا تھا۔ برہنہ، بے حیا، نہ اپنے ستر کی شرم نہ دوسرے کی شرم گاہوں کی پروا۔۔۔ خود غرض ننگی لو بھی فطرت کا اذیت ناک سچ۔۔۔۔۔۔ پورا قبرستان اگربتیوں، گلابوں، عطروں اور چوے کے باسی پانیوں سے بوجھل تھا۔ ڈونگھے لڑ میں جنات کے ہاں کوئی موت واقع ہو گئی تھی جننیاں لمبے گونجیلے بین ڈالتی تھیں جو تیز گام کے دھڑک دھڑک پہیوں سے لپٹے تھے۔ پوٹھوہار کے سارے پہاڑی سلسلے گونجتے تھے۔ میری کالی مرغی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"(16)

ناول میں طاہرہ اقبال نے پوٹھوہاری تہذیب و ثقافت کی بھرپور وکالت کی ہے۔ طاہرہ اقبال کے اپنی آبائی ثقافت سے جڑے پہلو اس ناول میں نظر آئے۔ طاہرہ اقبال کے مطابق جو لوگ اپنی ثقافت سے سے پیوستہ رہے، سرسبز رہے، جن لوگوں نے اپنا رابطہ

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

منقطع کر لیا وہ مرجھا گئے۔ ناول میں ستر اور اسی کی دہائی کے لوگوں کی تہذیب و ثقافت کے بارے میں لکھا گیا ہے جب دنیا کے بدلنے کے ساتھ پوٹھوہار میں بھی بڑے پیمانے پر تبدیلی آ رہی تھی۔ ثقافتیں اپنی آب و تاب کھو رہی تھیں۔ دم توڑتی ثقافت کے نوحے کا منظر طاہرہ اقبال نے اپنے الفاظ میں یوں پیش کیا ہے:

> "زرد پتوں پر جما کہرا پگھل کر موٹے موٹے آنسوؤں کی صورت ڈبڈبانے لگا۔ چوے کی سطح پر جمی باریک کانچ سی برف کی تہ پھٹ گئی تھی۔ برساتی جھیل کے کنارے گول گیٹیاں اور نوکیلے پتھر سفید کہرے میں لپٹے پگڈنڈیوں سے لڑھکتے اور بارش کے پانیوں میں بہنے لگے۔"(17)

سطح مرتفع پوٹھوہار پاکستان کے شمال مشرق میں واقع ہے جسے وادی سواں بھی کہا جاتا ہے اس علاقے کے مغرب میں کشمیر اور جنوب میں کے پی کے واقع ہیں۔ موجودہ کمشنری ڈویژن راولپنڈی میں جہلم، راولپنڈی، چکوال اور اٹک شامل ہیں۔ یہ علاقے بارانی کاشتکاری میں بے مثل ہیں۔ اس کے علاوہ عوام کا ذریعہِ معاش ملکی و غیر ملکی ملازمت زراعت اور تجارت ہے۔ یہاں کا قدیم پیشہ زراعت ہے۔ یہاں کے لوگ محنتی اور مخلص ہیں۔ پوٹھوہار کی زبان سرحدی ملاپ کے باعث ہزارہ ڈویژن کی مقامی زبانوں سے کچھ اثر لیتی اور کچھ اثر ان پر ڈالتی ہے۔ خطہ پوٹھوہار کی تہذیب صدیوں پرانی ہے، اس میں اب تک لاتعداد موڑ آئے۔ کئی جنگیں لڑی گئیں۔ بہت سے حکمران بدلے مگر خطہ پوٹھوہار کی تہذیب و ثقافت لطیف جذبات سے لبالب بھری پڑی ہے یہاں کوئی بھی آئے، مصلحتاً یا روزگار کے لیے یہاں کی محبت اس کے لیے اپنی بانہیں وا کر دیتی ہے جو اسے پلٹنے سے روکے رکھتی ہے مگر پوٹھوہار کی مقامی زبانیں چاہت کی شیرینی میں گھلی ہوئی ہیں۔ زبانوں کے لہجے خوشی اور غم میں اپنی منفرد ڈگر اختیار کر لیتے ہیں۔

اگر مجموعی طور پر بات کی جائے تو "گراں" طاہرہ اقبال کے پوٹھواری تہذیب کے تہ و بالا ہونے کا نوحہ ہے۔ وہ "گراں" کے نام سے پوٹھوہار کے ماضی اور حال کو لکھتی ہیں۔ وہ پوٹھوہار میں ماضی کے سادہ لوح دنوں کو لکھتی ہیں، جب وسائل کم اور چاہتیں لاتعداد ہوتی تھیں۔ جب ہر غم ہر آسودگی سانجھی ہوتی تھی۔ اس وقت گھر کچے اور رشتے پکے تھے۔ چاہتیں ایسی تھیں کہ ہر خاندان میں تمام چیزیں سانجھی تھیں۔ کسی ایک گھر میں مرگ ماتم کو سارے گراں والے مل بانٹ کر نبھاتے۔ موت کے موقع پر سوگ اور پرسہ دینے کے لیے آنے والوں کے لیے گراں کے لوگ چالیس دنوں تک گاؤں کے لوگ اور قریب دور کے رشتہ دار اکٹھے مخصوص جگہ پر بیٹھتے جہاں دن بھر تعزیت کے لیے قریب دور سے لوگ آتے۔ ان کی ثقافتی انداز میں خاطر مدارت ہوتی۔ عورتیں اپنے روایتی بین بنتیں جو پوٹھوہاری زبان میں ہوتے اور آہستہ آہستہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتے۔ بین ڈالنے والی

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

خواتین کی تعداد سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ کس کا متوفی سے کیا رشتہ تھا؟ موت کے موقع پر پورے گاؤں کی ہر قسم کی سرگرمیاں موقوف کر دی جاتیں اور سوگواروں کے ساتھ ان کا غم بانٹا جاتا۔ نہ صرف ماتم بل کہ اس پوٹھوہار کے ریت رواج سے روگردانی یا اس میں معمولی تغیر پر بھی صف ماتم بچھا رہتا۔ ناول کے کردار شکیلہ جان، زرینہ جان، صنوبر جان وغیرہ نے اس گراں کی ثقافتی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی زندگیاں ان نفوس کے انتظار میں تمام کر دیں جن سے وہ اپنے شعور سے قبل منسوب کر دی گئی تھیں لیکن جب غزل جان اور اس کے عہد کے دیگر لڑکیوں نے ان روایات کو بوسیدہ قرار دے کر اس کو جھٹلایا تو یہ بات پرانی نسل کے لیے انہونی تھی۔ اس پوٹھوہار کی ریت تھی کہ جو ایک بار کسی کے نام سے جڑ گئی، پھر اسی کا ہو کر مرنا اس کا مقدر ٹھہرا۔ یہی وجہ تھی کہ زرینہ جان جو صرف اپنے حوالدار کے کتبے کے ساتھ لگ کر عمر گزار رہی تھی کہ اس نے بیوہ ہونے کے بعد عقدِ ثانی کیا تو گاؤں کے لیے یہ اتنا انہونا تھا کہ پھر آٹھ دن کے لیے گاؤں میں موت آپڑی۔ زندگی میں دوسرے مرد کے دخل کا تصور بھی اس پوٹھوہار میں محال تھا۔ جو عورت جس مرد کے حصے میں لکھ دی جاتی اسی کی نسبت سے لگ کر وہ عمر گزار دیتی۔ ایک عورت کا اپنے شوہر کی وفات کے بعد اپنی مرضی سے کسی کو اپنا ہم سفر بنا لینا یا ایسی کوئی خواہش کرنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا اور جو عورت ایسا کرتی تھی، وہ پھر لوگوں کے طعن و تشنیع کا شکار بنتی تھی۔ اسی کیفیت کو طاہرہ اقبال یوں لکھتی ہیں:

> "ہائے ظلمی! سارے پوٹھوہار میں نہ کبھی سنا نہ تکا، زنانی جس نام لگی اسی کی ہو مری۔۔۔ ہائے پتہ نہیں انور خانے نے کس حال میں دیکھی کہ آپ ہی کو گولی مار مرا۔ گولی کے لائق تو یہ کنجری تھی۔ ہائے متھے کی کالک۔۔۔ ہائے لچی، لال کرتی کی کنجری۔۔۔ جیسے یہ کالک عورت ذات کے منہ پر مل گئی ہو۔ یہ تو وہ وسیب تھا جہاں میاں بیوی کبھی دن کی روشنی میں بات کرتے نہ دیکھے گئے تھے۔ مرد زنانی حصے میں کبھی مجبوراً آتے بھی تو ڈیوڑھی میں کھنگورا مار کر پہلے مطلع کرتے۔"(18)

اسی طرح مردوں کو بھی عورتوں کے معاملے میں اپنی مرضی کی اجازت نہ تھی۔ ایک دفعہ کے جڑے تعلق کو ساری عمر نبھانا یہ یہاں کے مردوں کی ریت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ شکیلہ جان کا طلاق نامہ جب گاؤں کا ڈاکیا لے کر آیا تو اس نے موت جیسا کہرام برپا کیا۔ عورتوں نے پھر سے بین ڈالے اور گاؤں کی دیگر سرگرمیوں کو موقوف کر دیا گیا کہ گاؤں میں سوگ اور رنج کا سا سماں تھا۔

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

پوٹھوہار کے باسی اپنے غموں کو مل بانٹ کر کم کرنے کے فن کو جانتے ہیں تو خوشیوں کو بڑھانے کے لیے بھی یہ بے مثال ہیں۔ کوئی تہوار ہو، میلے ہوں یا فصلوں کی کٹائی کا وقت یہ ہر موقع کو یوں مناتے کہ معمولی چیزوں سے راحتیں کشید کرنے کے معنی سمجھا دیتے۔ شادی بیاہ قدیم پوٹھوہاری طریقے سے منائے جاتے، مہندی مایوں پر ہلدی مل کر رسم کی جاتی۔ عورتیں اپنے اپنے منگیتروں اور خاوندوں کے لیے جو روزی کی تلاش میں دور نکل گئے ہوتے، قدیم ثقافتی پکوان بنا کر بھجواتیں جن پر اپنے مختلف آرائش کے زیورات سے نقش بناتیں۔ اون کو کبھی سلائیوں کی مدد سے مشکل بل دے کر اپنے من پسند محبوب کے لیے گرم ملبوس تیار کیا جاتا جو ان کو دور دراز علاقوں میں بھیجے جاتے۔ یہاں کی ثقافت نے نیا رخ تب لیا جب ولایت سے کمائی یہاں آنے لگی۔ یہاں دولتیں تو کثرت سے آئیں لیکن گراں بھر کے پر رونق اجتماعات موقوف ہو گئے۔ اب گندم کی بالیوں سے دانے نکالنے کو نسلی بیل نہ پالے جاتے بل کہ اس کی جگہ ٹریکٹر اور ہارویسٹر نے لے لی تھی۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ مصنفہ نے قدیم اور جدید دونوں ادوار کا تہذیب و ثقافت کے تناظر میں لاشعوری طور پر تقابل پیش کر دیا ہے۔

پہلے یہ دستی کام ہوتے تھے جن کو کرنے کے لیے گاؤں کے سب لوگ جمع ہوتے تھے۔ خواتین مخصوص کھانے بناتیں، حلوے کا اہتمام ہوتا، دقت طلب کام کی مناسبت سے طاقت ور غذاؤں کا اہتمام ہوتا۔ علاقے کے بزرگ اس موقع پر بیلوں کی کارکردگی دیکھنے آتے تھے لیکن اب جدید مشینری سے یہ کام چند گھنٹوں میں کرنے سے بہت سا وقت اور قوت بچ جاتی ہے۔ اب اس پوٹھوہار میں کاشتکاری کے کام آنے والی زمینوں پر باہر کے لوگوں نے کئی منزلہ عمارتیں تعمیر کر دی تھیں۔ اب کے ماتم پر پھوڑی کا رواج نہ تھا اس ثقافتی دور کے گزر جانے کا اصل نقصان یہ ہوا کہ اب سانجھ ختم ہو گیا تھا۔ غیر دیسوں سے جو کمائی آتی تھی وہ تعداد میں بہت زیادہ تھی لیکن ان کو سینت سینت کر رکھنے کے رواج نے نمو پائی تھی، کھانے یا دوا پر خرچ کرنے کا تصور ہی محال تھا۔ گھروں سے مرد ولایت کو سدھار گئے اور خواتین نے اپنا مقصدِ حیات ان کی بھیجی ہوئی کمائی کو سنبھال کر ہی رکھنا بنا لیا۔

طاہرہ اقبال پوٹھوہار کی ثقافت کے ساتھ ساتھ انگلستان میں مقیم ان دیسی لوگوں کی حالت کو لکھتی ہیں یہ لوگ جو وطنوں کو خیر باد کہ کر کمائی کرنے کی غرض سے ان برفیلے علاقوں کو آئے پھر یہاں کی کرنسی کی چکا چوند اور رعنائیاں ان کو واپسی کی راہ نہ دکھا پائیں، پھر ان کے ساتھ یہ عجب سانحہ ہوا کہ یہاں کی مستقل سکونت کے بعد ان کے بچوں کو یہ خوف لاحق ہوا کہ ان کے بچوں کی

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

اپنی آبائی ثقافت سے جڑت بھی ضروری ہے لیکن بچے جو اس مادر پدر آزاد معاشرے میں دن بھر رہ کر ایک ایسی ثقافت سے کیسے منسلک رہ سکتے تھے جسے ان کے والدین نے ان کی پیدائش سے قبل ترک کر دیا تھا۔

یہ مشرقی باشندے ہمیشہ مشکل حالات سے دوچار رہتے ہیں۔ ناول کا اہم کردار غزل جان اس عرصے میں اس سکھنی کا مقابلہ اپنی ماں سے کرتی کیوں کہ اس کے خیال میں اس کی ماں کے تمام تر دکھوں کی وجہ یہ عورت رہی ہے حسن۔ کور مذہب کی سکھ ہے جو 1947ء کے فسادات سے قبل اسی پوٹھوہار کی باسی تھی۔ مذہبی رواداری جو پوٹھوہار میں پائی جاتی تھی اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ آزادی سے قبل یہاں ایک ہی سکھ گھرانہ آباد تھا، اسے اقلیتی تحفظ... حاصل تھا۔ حزن سنگھ کی بیٹی تھی جو پوٹھوہار کی وفاشناس عورتوں کی طرح اپنے ہم سفر کا غم سینے میں دبائے جی رہی تھی، اس کے بقول اس کی کالی مرغی کھو گئی تھی اور اس کا دل ٹھکانے نہ رہا تھا حسن۔ کور جو پوٹھوہار کو خیر باد کہ دینے کے بعد بھی اپنی زندگی میں اس مغربی کلچر کو داخل نہ کر پائی لیکن انھی کی بیٹی ہارٹ کور کو مکمل طور پر اسی بے لباس تہذیب کا پروردہ دکھایا گیا ہے۔ تاج محل کی زمین آگرہ جا باسی اور ہارٹ کور اپنی مشرقیت کو بھلا کر پوری تہذیب سے مادر پدر آزاد معاشرے کے غلاظت بھرے سمندر میں غوطہ زن تھے۔ جن کے نزدیک معاشرے میں سر اٹھا کر جینے کی خاطر یہ مغربیت کا لبادہ ناگزیر تھا لیکن غزل جان اس معاشرے میں مشرق سے مفرور ایک کردار ہے جو ان جذبوں کی متقاضی ہے جن کے وجود سے یہاں کے ناواقف لوگ ہیں۔ اب تاج محل کی محبتوں کا چلن روایتی نہیں رہا۔ یورپ کے ان برفیلے جذبوں میں محبتوں کی یہ ریت اتنی مختصر ہو چکی کہ درمیان میں ہجر و فراق، رومانوی گفت گو، خط و کتابت اور انتظار جیسی تمام کڑیاں تمام مراحل کو ترک کر کے انتہا کو پہنچنا اس سرزمینوں کی محبتوں کا وطیرہ تھا۔ یہاں مصنفہ پوٹھوہار کی تہذیب کا موازنہ یورپ کی تہذیب سے کرتی نظر آتی ہیں اور اس طرح انھوں نے اس ناول کے ذریعے پوٹھوہار کی قدیم ثقافت اور پھر وقت کے ساتھ تغیر و تبدل سے پروان چڑھنے والی جدید طرزِ زندگی کو بھی عیاں کیا ہے اور پھر مغرب کی ثقافت کا پوٹھوہاری ثقافت سے موازنہ اس انداز سے پیش کیا کہ پوٹھوہار کے خطے کا ہر مثبت پہلو اجاگر کر کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ یہ مصنفہ کی اس خطے سے محبت، لگاؤ اور تحقیق و مشاہدے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

حوالہ جات

1۔ عبد الباری، ڈاکٹر، لکھنؤ کے شعر و ادب کا معاشرتی و ثقافتی پس منظر، یوپی، جی ایس پی جی کالج سلطان پور، مئی 1987ء، ص 22

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

2۔عبدالحمید، ڈاکٹر، ابتدائی معاشریات، لاہور، سٹینڈرڈ بک ہاؤس، 1994ء، ص240

3۔طاہرہ اقبال، گراں، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، 2019ء، ص22

4۔ایضاً، ص26

5۔ایضاً، ص28

6۔ایضاً، ص35

7۔ایضاً، ص36

8۔ایضاً، 42،41

9۔ایضاً، ص42

10۔ایضاً، 51

11۔ایضاً، 42

12۔ایضاً، ص72،71

13۔ایضاً، ص126،125

14۔ایضاً، 138،137

15۔ایضاً، ص106

16۔ایضاً، ص196

17۔ایضاً، ص182

18۔ایضاً، ص199،198